جلد02 شمارہ۱۸، ۲۰۲۴

Article

Integration of Saraiki words in Urdu literature of Taunsa region and its cultural impact on linguistic expression

خطہ تونسہ کے اردو ادب میں سرائیکی الفاظ کا انضمام اور لسانی اظہار پر اس کا ثقافتی اثر

Asif Javed*[1], Dr. Ghulam Asghar
[1]Scholar Ph. D, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.
[2]Assistant Professor, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.
*Correspondence: asghar.khan@iub.edu.pk

آصف جاوید[1]، ڈاکٹر غلام اصغر[۲]
[۱]اسکالر پی ایچ۔ڈی، شعبۂ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور، [۲]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور۔

Abstract: Urdu literature, deeply rooted in our civilization and culture, has flourished over time, leading us to ponder the intricate relationship between these two seemingly distinct entities—civilization and literature. How do they harmonize? The writers of the Taunsa region offer an insightful response. Historically part of the ancient province of Multan, Taunsa has witnessed the growth of Urdu literature amidst the Balochi culture of the Koh-e-Sulman range and the Saraiki influence of the Indus civilization.
In the case of Taunsa, this literature becomes an embodiment of deeply internalized regional influences, from which it cannot be disentangled. The local writers, through the infusion of Saraiki words and cultural nuances into Urdu literature, have breathed new life into classical schools of thoughts of Urdu and Sraiki also.

Keywords: Urdu literature, Taunsa, Saraiki, culture, Indus civilization, Cultural integration, Linguistic evolution.

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:13-07-2024
Accepted:25-09-2024
Online:27-09-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

تونسہ محض شہر نہیں بلکہ ایک تہذیبی خطہ ہے، اگر کراچی سے پشاور انڈس ہائی وے سے سفر کریں تو غازی خان میرانی کے نام سے بسائے گئے شہر ڈیرہ غازی خان سے شمال کی طرف ۶۰ کلومیٹر کے بعد یہ خطہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح اگر آپ پشاور سے کراچی کی جانب انڈس ہائی وے پر سفر کر رہے ہیں تو قصبہ رمک سے آگے کاٹھ گڑھ سے خِطہ تونسہ شروع ہو جاتا ہے۔

تونسہ کا شہر ڈیرہ غازی خان شہر سے شمال کی جانب ۸۰ کلومیٹر دور اور اس طرح ڈیرہ اسماعیل شہر سے جنوب کی جانب ۹۵ کلو میٹر دور ہے۔ ۲۰ سے ۳۰ کلومیٹر مشرق کی طرف عظیم سندھ، انڈس، ڈھنڈ مہویا اباسین ہے جس کے خطہ تونسہ کے تہذیبی ورثے پر صدیوں کے انمٹ نشانات ہیں، جب کہ مغرب کی جانب ۱۵ کلومیٹر بعد تاجدار کوہ سلیمان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ڈیرہ غازی خان سے شمال کی جانب انڈس ہائی وے سے متصل علاقہ جو ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحد تک جاتا ہے؛ کو ہم تونسہ کے خطے میں شامل کرتے ہیں۔ یہاں سے شرقی جانب دریاسندھ کا میدانی علاقہ بیٹ سے لے کر غربی جانب کو سلیمان کے کچھ بلند چوٹیوں کے اگلی جانب تک جہاں سے بلوچستان کی سرحد شامل ہوتی ہے؛ بھی اسی خطے کا حصہ ہے۔ شمال مغرب میں اس خطے کے ڈانڈے موسیٰ زئی شریف اور وزیرستان ایجنسی تک ملتے ہیں۔ خطہ تونسہ کا مجموعی رقبہ قریباً ۲۷۶۹ مربع کلومیٹر ہے۔ اس علاقہ کو سیر اب کرنے والی سب سے بڑی پہاڑی ندی کا نام سنگھڑ ہے، اس لیے اس خطے کا قدیم نام بھی سنگھڑ ہی ہے۔ اس کے علاوہ، کہنواں، گنگ اور کھڈ بزدار رود کوہیاں اس سرزمین کو سیر اب کرتی ہیں۔

تونسہ کی سرزمیں اردو، سرائیکی اور بلوچی ادب کی رنگینیوں میں رچی بسی ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں مختلف ثقافتیں گلے مل رہی ہیں۔ اس لحاظ سے اس خطہ زمیں میں ادب کی ہمہ جہتی بڑھ جاتی ہے۔

خطہ تونسہ کے ادبی کلچر میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی کی آمد کے بعد اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے یہاں کی ثقافت اور تہذیب ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ علم، ادب اور تصوف سے یہ خطہ جگمگانے لگتا ہے۔ جنگِ آزادی سے پہلے یہاں اردو وارد ہوتی ہے۔ محمد اسلم ملغانی سیر دیہات کے عنوان سے ایک ناول لکھتے ہیں، جس میں اس ٹیکس سے چھوٹ کی بات کی جاتی ہے، جو مقامی لوگوں پر عائد کیا جاتا تھا۔ دبستانِ سلیمانیہ کے خانقاہی ادب میں فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی استعاروں کو بھی فروغ ملتا ہے۔ چوں کہ حضرت سلیمان، وادی درگ کوہ سلیمان سے آئے تھے اور سرائیکی میں مردِ کوہستانی کو "روہیلہ" کہتے ہیں اس نسبت سے آپ آج بھی مقامی لوگوں میں "روہیلہ پیر" کے نام سے مشہور ہیں۔

فکر تونسوی تونسے کے ادب کا استعارہ ہیں۔ وہ اپنی تونسہ میں پیدائش کے متعلق یوں لکھتے ہیں، جس میں اُس وقت اس خطے کی مکمل بدحالی کی تصویر کھینچی گئی ہے:

> "میں جس گاؤں میں پیدا ہوا، وہاں میرے پیدا ہونے کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ وہاں بچوں کی خاصی تعداد پہلے سے موجود تھی۔ حتیٰ کہ کتوں، بلیوں تک کے بچے پیدا ہو جاتے جو بغیر ضرورت کے پیدا ہو کر مر جاتے۔ میں بھی اسی طرح کا ایک غیر ضروری بلونگڑا ہوں، صرف اس لفظی فرق کے ساتھ کہ میں اشرف المخلوقات۔ بلونگڑا مر جاتا تو

غلیظ ڈھیری سے اٹھا کر جنگل میں پھینک دیا جاتا اور میں مر جاتا تو چیتھڑوں میں لپیٹ کر ندی میں پھینک دیا جاتا۔ تاریخ میں نہ جنگل کا ذکر آتا اور نہ ندی کا۔"[i]

صدیوں پہلے تونسہ کے میدان صوبہ ملتان کا حصہ رہے ہیں۔ سو اس کی تہذیب و ثقافت میں اب بھی ملتانی عکس کا نیلگوں رنگ ملتا ہے۔ اس حوالے سے ہم اس علاقے کو ملتانی ادب کا جزوِ خاص کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شیر از دستی نے سا سا ناول لکھ کر اردو فکشن میں تہذیبوں کے ٹکراو کی بات کی، لیکن ۱۱/۹ اور امریکہ کی تہذیب کو وہ خطہ تونسہ کی آخری رود کوہی کھڈ بزدار کا لینڈ اسکیپ فراموش نہ کر سکے۔ ان کے یہاں ہمیں تونسہ کے چھوٹے سے گاؤں کاٹھ گڑھ کا پرانا سکول ملتا ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی ماسٹر جی پر غصہ آتا تھا۔ اگر اتنا ہی مشکل تھا تو مجھے کیوں دیا یہ سوال؟ میرا اتنا وقت برباد کرنے کی کیوں ضرورت تھی؟ مجھے کیا پتہ محبت کہاں ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے محبت نام کی خدا نے کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی۔ ماسٹر جی نے جھوٹ بولا مجھے تنگ کرنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ بھی گاؤں کی ان چیزوں میں شامل ہے جو گم شدہ ہیں۔۔۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ تلاش جاری رکھنے میں کیا حرج ہے۔ میری زندگی میں جستجو تو ہے، لایعنی سا ہی سہی، سوال تو درپیش ہے۔"[ii]

احمد ندیم تونسوی آج کل کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ عالمی ادب سے متاثر انھوں نے اپنی تحریروں میں بہت سی تکنیکوں کو متعارف کرایا ہے، لیکن وہ بھی تونسہ کی زمین و ثقافت سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ خزاں کے آخر میں، جاڑے شروع ہونے سے پہلے خطہ تونسہ کے لوگ ان کونجوں کے ڈار کو کبھی نہیں بھلا سکتے جو یہاں سے گزرتی ہیں اور کوہ سلیمان کی مختلف چھوٹی جھیلوں پہ قیام کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے افسانے "آشوب" سے یہ پیراگراف دیکھیں:

"میں کہانی ہی سُنا رہا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا کہ آج ماگھ کی پندرہ ہے۔ چاچا کریم! جھیل پر سرد ملکوں کے پرندے، زیادہ دیر بھی ہو تو، کب تک پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔" میں نے بوڑھے کریم سے پوچھا۔

"پندرہ کاتک تک۔۔۔" بوڑھے کریم نے یقین کے ساتھ کہا۔

"کہانی یہ ہے کہ پندرہ کاتک کو گزرے آج پورا مہینہ ہو چکا ہے اور ابھی تک جھیل پر ایک بھی پرندہ نہیں پہنچا"، میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"[iii]

اس طرح خطہ تونسہ میں اردو شاعری جنم لیتی ہے تو یہاں کی تہذیب و ثقافت کو ایک خوب صورت پر تو ملتا ہے۔ کیوں کہ شاعری ادب کی وہ صنف ہے جو بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ:

> "شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی ہے، احساسات کی حسین مصوری ہے، تخلیل کا ایک رقص دلفریب ہے، وہ جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی۔ اس کا اثر دل اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے وہ حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے وہ جذب و شوق کی ایک لغزش مستانہ ہے عقل و شعور کا ایک حسین ارتعاش ہے، حسن وجمال کی ایک دل موہ لینے والی لطیف تھر تھراہٹ ہے۔ ہمارے ایک شاعر نے اس کو عقل وجنوں کی مشترک بزم جمال اور عشق و حکمت کا مقام اتصال کہا ہے یہ محض شاعرانہ خیال نہیں ایک حقیقت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی بدولت انسان اپنی سطح سے بلند ہو جاتا ہے اس کی روح میں کچھ اس طرح نغمے گونجتے ہیں کہ خود اس کی ہستی ایک نغمہ بن جاتی ہے۔"[iv]

خطہ تونسہ کے ادب میں سرائیکی زبان میں ڈوہڑے اور کافیاں جنم لینے لگیں۔ یہاں یہ بات بڑی اہم ہے کہ یہاں سرائیکی شاعر اردو میں بھی شاعری کرنے لگے۔ جن میں ڈاکٹر نذیر قیصرانی، ظہور احمد فاتح، رشید قیصرانی، طاہر تونسوی اقبال سوکڑی، جاوید ملک، فاروق فیصل، تہذیب حافی، ممتاز گورمانی اور دیگر شعراء شامل ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی فکر میں صداقت ہے مصلحت نہیں ہے۔ وہ اردو ادب کا معتبر نام ہیں ان کی شاعری ولولے حوصلے بڑھاتی اور جذبے گرماتی ہے۔ وہ نام نہاد شعراء سے بھی نالاں ہیں کہ جو قلم کی حرمت بیچ کر مفادات کے کشکول بھرتے ہیں۔ ان کو فطرت کی طرف سے وجدان سلیم عطا ہوا ہے جو انھیں شعر کہنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو قرطاس پر لانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی خطہ تونسہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کی کتاب توطے ہوانا سے یہ اشعار دیکھیں:

یہ دور اہل قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری — گناہ کو بھی ثواب کہنا ببول کو بھی گلاب لکھنا
ہری بھری کھیتیاں کہاں ہیں مرے مقدر کے زائچے ہیں — شہید عشق وفا کا طاہر ہتھیلیوں پر حساب لکھنا[v]

ببول (کیکر کا کانٹا)، یہ درخت تونسہ میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ببول خطہ تونسہ کا عام مستعمل لفظ ہے۔ اگلے شعر میں "وہ ہری بھری کھتیاں کہاں میرے مقدر کے زائچے میں" خطہ تونسہ کی پیاس (تس) کا لاشعوری طور پر ذکر کرتے ہیں۔ طاہر تونسوی کا ایک اور شعر ہے:

میں اس سے وفا مانگ ہی لیتا دم آخر
صد حیف کہ پندارِ ہنر جاتا ہے سائیں[vi]

وسطی پنجاب میں لفظ "سائیں" مجذوب کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن تونسہ اور وسیب میں یہ لفظ عزت، احترام اور وقار دینے کے لیے سابقے کے طور پر سرائیکی میں استعمال ہوتا ہے۔ اب اس شعر میں نہ صرف انھوں نے لفظی ضرورت پوری کی ہے بلکہ اردو شاعری میں "سائیں" کا اضافہ بھی کیا ہے۔ ظہور احمد فاتح، تونسہ کے استاد شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کے آستانۂ ادب سے درجنوں تلامذہ سیراب ہوئے۔ ان کی ایک مختصر بحر کی غزل کے دو شعر دیکھیے:

وقت کے مارے جھڑتے پتے　　　جیون لمحے سوکھے پتے

جیسے بے بس تاش کے پتے[vii]　　　یوں مجبور ہے مفلس انساں

"وقت کے مارے" خالص سرائیکی زبان کی ترکیب ہے۔ جو ایسے انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا ماضی شاندار ہو لیکن اب کڑے وقت سے گزر رہا ہو۔ اس طرح فاتح صاحب کا ایک اور شعر جس میں انھوں نے سرائیکی لفظ "رول دیا" کا استعمال کیا ہے:

تجھے فاتح اس نے رول دیا، آلام دریچہ کھول دیا

تو اِک یاقوت یگانہ تھا اس بات کو برسوں بیت گئے[viii]

خطہ تونسہ کے باسیوں کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو گزارا نہیں "سہا" ہے۔ اس طرح کی کیفیت ظہور احمد فاتح کے اس شعر میں بھی نظر آتی ہے:

ہم جام پی رہے ہیں یا زہر پی رہے ہیں

کیسی یہ زندگی ہے مر مر کے جی رہے ہیں[ix]

تونسہ کا ادب یہاں کی ثقافت اور اس کے باسی کے ساتھ گندھا کھڑا ہے، یہاں کے لکھاری ایک ہی سیاسی ورثے کے مالک ہیں، اس لیے ان میں یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن رنگ سب کے جدا جدا ہیں۔ درحقیقت علاقائی اثرات اور ثقافت ہر ادیب کے باطن کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں کیوں کہ ادیب معاشرے کا حساس، دردمند اور دوربین فرد ہوتا ہے۔ ادیب و شاعر کا بچپن جس علاقے میں بسر ہوتا ہے اور وہ زندگی بھر جس علاقے میں رہتا بستا ہے وہاں کی زبان اور تہذیب و ثقافت کے اثرات اس کے لاشعور میں اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں کہ اس کی تخلیقات میں کہیں نہ کہیں ان کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ادب میں علاقائی اثرات کا وجود ایک ایسا وصف ہے جو اپنے تخلیق کار کے، کسی مخصوص علاقے سے وابستہ ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ تونسہ کے لکھاریوں پہ اس علاقے کے اثرات ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خطہ تونسہ پسماندہ علاقہ ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر منظور احمد بھٹہ لکھتے ہیں:

> "غربت، بیروزگاری اور پسماندگی علاقے کا اہم مسئلہ ہے، صحت کی سہولتیں ناپید ہیں۔ سنگھڑ، کھڈ بزدار اور شوری کی رود کوہیاں ہر سال تونسہ میں موت بانٹتی ہیں۔ کوئی اچھا تعلیمی ادارہ؛ میڈیکل و انجینئرنگ کالج تو کیا کسی یونیورسٹی کا کیمپس بھی منظور نہیں ہوا ہے۔"[x]

لیکن ان محرومیوں نے تونسہ کے ادب اور شاعری کے لیے عمل انگیز کا کام دیا ہے۔ یہ اس بات کی غمازی ہے کہ بحران بھوک کا ہو، یا پیاس کا، یا پھر جنگ کا؛ اسی صورتِ حال میں ادب پنپتا ہے۔

رشید قیصرانی نے اردو شاعری میں خطہ تونسہ میں زباں کے حوالے سے اچھوتے تجربے کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں تونسہ کی ثقافت، یہاں کے باسیوں کا رہن سہن، معیشت اور زمین جھلکتی ہے:

تیری خاطر میں تو سرمئی شام سے آکر بیٹھا تھا   سب سے اونچے ٹیلے پر میں آگ جلا کر بیٹھا تھا

تیرے لیے میں ڈیرہ غازی خاں سے جھمکے لایا تھا   اپنے گاؤں سے گنے اور مرونڈے لایا تھا[xi]

اردو شاعری میں فصیلِ لب، صدیوں کا سفر تھا، نین جزیرے، سجدے جیسے شعری مجموعے اپنے اچھوتے پن کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ رشید قیصرانی نے مروجہ استعاروں، تشبیہوں، تمثیلوں، تراکیب اور الفاظ ترک کر کے نئی طرز پر شاعری کی عمارت کھڑی کر کے یار لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اس طرح لاہور باغات کا شہر ہے۔ لاہور والے اگر گلوں میں رنگ بھرنے، بدِ نو بہار کے چلنے اور گلشن کے کاروبار کی بات کریں تو یہ ان کی نفسیات اور شعری مزاج کے عین مطابق ہو گا۔ لیکن مجھ جیسا بندہ صحرائی جس کے ماحول میں گلشن نام کی کوئی چیز نہیں اگر وہ بھی گلشن اور اس سے وابستہ لفظیات چاہے علامت کے طور پر استعمال کیوں نہ کرے، پھر بھی یہ روش سہل انگاری، اپنے ماحول سے لاتعلقی اور دوسروں کی تقلید کے زمرے میں آئے گی۔
> “[xii]

قیصرانی کے اسلوب بیاں میں ندرت اور لفظوں میں جادو کی سی تاثیر ہے۔ انھوں نے دوہوں میں سرائیکی اور ہندی الفاظ اجرک، تھلوچڑ، کجاوہ سمی، جھمر، مندری، نمانڑیں، سانول، سائیں، مہار، کنگال، روپ سروپ، دیپ، پنچھی، جوت، من وغیرہ کا استعمال ایسے قرینے اور سلیقے سے کیا کہ وہ غیر مانوس نہیں لگتے، ان کے دوہوں میں صوفیانہ اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ جو خطہ تونسہ کا خاصہ ہے۔

”لسی پانی پوچھنا“ سرائیکی کا روزمرہ ہے جسے رشید قیصرانی نے اردو شاعری میں خوب صورتی سے برتا ہے:

تیرے در پہ آئے تھے کچھ لوگ بڑے ارمانوں سے

لسی پانی پوچھ تو لیتے گھر آئے مہمانوں سے[xiii]

قیصرانی کے اظہار میں تونسہ کا وسیبی رنگ صاف چھلکتا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قیصرانی نے اپنے درویشوں جیسے من کے ساتھ اپنی مفلس دھرتی کے تمام رنگ اپنی شاعری کی مالا میں پروئے ہیں۔ ان کی ایک نظم ”تیرا شہر اور میرا گاؤں“ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرا شہر صنوبر والا پوٹھوہار کا چہرہ ہے   میرا کیکر والا گاؤں تھل دامان کا سہرا ہے

تیرے شہر کے بنگلوں میں ہیں قصے اجلی کاروں کے | میرے گاؤں کی بیٹھک میں بھی چرچے گھوڑ سواروں کے
تیرے شہر کی کیا باتیں ہیں اجلا شہر جیالے لوگ | میرے گاؤں کی زینت ہیں کچھ اونچے، شملوں والے لوگ
تیرے شہر کے لڑکے بالے نام کمائیں کھیلوں میں | میرے گاؤں کے گبھرو ڈالیں جھمر، میلوں ٹھیلوں میں
تیرے شہر کے لالہ و گل بھی مانا من متوالے ہیں | میرے گاؤں کے پھوگ سنوار بھی یار بڑے دل والے ہیں
اپنے شہر سے لال گلابی پھول سجا کر لانا تم | میرے گاؤں میں نیلے پیلے پیلو چننے آنا تم[xiv]

ذات کے صحرا کو کسی روندی ہوئی رہ گزر کے ذریعے طے نہیں کیا بلکہ اپنے قدموں سے ریت پر ایک نیا راستہ بنایا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کے اسلوب پر بھی کسی اور کے اسلوب کی پرچھائیں نہیں پڑی۔ ان کے کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں جو خطہ تونسہ کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں:

تو خود ایک مسرت میلہ کیسی مسکان دکھاوے کی | تو ہی بتا اب کون سنبھالے ایسی جھول کجاوے کی

خاموشی کی جھیل میں سانول کوئی انوکھا پتھر ڈال | سمی کے دو بول سنا یا جھوم کے کوئی جھمر ڈال

بیری بیری بور لگا ہے سرسوں سرسوں پھول کھلے | لوٹ آئے یار پرانے سانول تم کب آؤ گے؟

کیسے سرک سرک کے بھری گاگریں گریں | جب میرے ساتھ ساتھ کوئی منچلی چلی

ہجرت، پیاس، سوکھے پیڑ خطہ تونسہ کا نمائندہ استعارہ ہیں۔ اس بارے میں رشید قیصرانی یوں کہتے ہیں:

کچھ سائے سے ہر لحظہ کسی سمت رواں ہیں | اس شہر میں ورنہ نہ مکیں ہیں نہ مکاں ہیں
ہم خود سے جدا ہو کے تجھے ڈھونڈنے نکلے | بکھرے ہیں اب ایسے کہ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں[xv]

تہذیب حافی ان استعاروں کو یوں بیان کرتا ہے کہ خطہ تونسہ میں زندگی کا رنگ قاری کو صاف نظر آنے لگتا ہے۔ پیڑ تہذیب کی شاعری کا مضبوط استعارہ ہیں لیکن سوکھے پیڑ خطہ تونسہ کی نمائندگی کرتے ہیں:

کسے خبر ہے کہ عمر بس اس پہ غور کرنے میں کٹ رہی ہے | کہ یہ اداسی ہمارے جسموں سے کس خوشی میں لپٹ رہی ہے

مجھ ایسے پیڑوں کے سوکھنے اور سبز ہونے سے کیا کسی کو | یہ بیل شاید کسی مصیبت میں ہے، جو مجھ سے لپٹ رہی ہے

ترے لگائے ہوئے زخم کیوں نہیں بھرتے | مرے لگائے ہوئے پیڑ سوکھ جاتے ہیں

پیڑ مجھے حسرت سے دیکھا کرتے تھے　　　　میں جنگل میں پانی لایا کرتا تھا[xvi]

تونسہ کا اردو ادب محض ماضی کے آثار کے طور پر نہیں بلکہ ایک متحرک اور ناگزیر قوت کے طور پر ابھرتا ہے جو ہمارے ثقافتی شعور اور اجتماعی تشخص کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کی لچک اور مطابقت صرف پرانی یادوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے تانے بانے تک پھیلی ہوئی ہے، یہ ادب یہاں کے لوگوں کے جذبات کو سمجھنے، سماجی مسائل کے ساتھ مشغول ہونے، لسانی ورثے کو محفوظ رکھنے اور عالمی سطح پر جڑنے کے طریقے پر اثرانداز ہوتا ہے جدید دنیا کی پیچیدگیوں میں پھنسے انسان کے لیے اپنی دھرتی، الفاظ اور رشتوں کی عکاسی کرتا یہاں کا اردو ادب الہام، عکاسی اور ربط کا ایک اہم ذریعہ ہے، جو ہمیں انسانی تجربے کی گہرائی اور تنوع کے متعلق آگاہی فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱) فکر تونسوی، ”خود نوشت“، مشمولہ: تذکرۂ شعرائے تونسہ شریف، از: جسارت خیالی (کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۵ء)، ص ۳۸۔

۲) محمد شیر از دستی، ساسا (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۹۔

3) [iii] https://www.facebook.com/permalink.php/?story_fbid=4061342657269597&id=400080563395843

۴) عبادت بریلوی، شاعری کیا ہے (لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۹ء)، ص ۹۔

۵) طاہر تونسوی، ”ٹوٹے ہوانا“، مشمولہ: تذکرۂ شعرائے تونسہ شریف، از: جسارت خیالی، ص ۱۱۰۔

۶) ایضاً۔

۷) ظہور احمد فاتح، ”پہلی بات ہی آخری تھی“، مشمولہ: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل، شبیر ناقد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۔

۸) ظہور احمد فاتح، ”محرابِ افق“، مشمولہ: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل، شبیر ناقد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۵۔

۹) ظہور احمد فاتح، ”کچھ دیر پہلے وصل سے“، مشمولہ: ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل، شبیر ناقد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۸۔

۱۰) پروفیسر منظور احمد بھٹہ، تونسہ کا منظر نامہ (ملتان: جھوک پبلشرز، جنوری ۲۰۱۳ء)، ص ۱۴۔

۱۱) رشید قیصرانی، نین جزیرے (لاہور: اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء)، ص ۷۸۔

۱۲) ایضاً، ص ۱۷۔

۱۳) رشید قیصرانی، صدیوں کا سفر تھا (لاہور: اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۵۔

۱۴) رشید قیصرانی، نین جزیرے، ص ۷۳۔

۱۵) رشید قیصرانی، صدیوں کا سفر تھا، ص ۳۸۔

16 https://qindeelonline.com//tahzeeb-hafi-apni-masti-men-bahta-darya-hun%20/